

مولانا ارشاد الحق اثری

قسط نمبر ۳
(آخری)

اختلاف امت اور مسلک اعتدال

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اور ان کے شاگرد رشید حافظ ابن قیمؒ کو بھی لمبھی معنوں میں جنلی کہا گیا ہے ورنہ تقلید کے خلاف ان کے بیانات کوئی ڈھکے پھپھے نہیں۔ بلکہ تقلید شخصی کو تو وہ یہودیت کے منجھڑ ملاہ سے استلحاق کے مترادف جانتے ہیں۔ فتاویٰ شیخ الاسلام اور اعلام الموقعین لاسن قیمؒ میں تقلید و جمود کی چیرہ دستیوں کی جو داستان انہوں نے بیان کی ہے وہ باعث عبرت ہے۔ مگر افسوس کہ تقلید کی بیماری سے متاثرہ اذہان انہیں مقلد باور کرانے پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔

فقہی مسائل میں ان کے اپنے اجتہادات اور اقوال بھی ہیں۔ ان کے اگر بعض فتوے کو ”شاذ“ قرار دیا گیا ہے تو یہ کونسی اجنبی بات ہے۔ صحابہ کرامؓ سے لے کر بعد کے مجتہدین تک کے اقوال میں ”شاذ اقوال“ پائے جاتے ہیں۔ جیسا کہ کسی بحث سے مخفی نہیں۔ ضرورت محسوس ہوئی تو ان شاء اللہ ان کی نشاندہی بھی کر دی جائے گی۔ جن حضرات نے حضرت عیسیٰ علیہ السلامؑ تک کو حنفی بنا دیا ہو ان کو دوسرے مجتہدین کیوں کر گوارا ہو سکتے ہیں۔ جیسا کہ الدر المختار ص ۵۶ میں علامہ علاء الدین الحسکوی نے اور ذب ذبابات الدراسات ص ۲۷۱ میں علامہ عبد اللطیف ٹھٹھوی وغیرہ نے حضرت عیسیٰؑ کا حنفی ہونا بڑے فخر سے بیان کیا ہے۔ بلکہ بعض عاقبت نا اندیش حضرات نے تو اس کے متعلق ایک ایسا عجیب و غریب واقعہ بیان کیا ہے جسے نقل کرتے ہوئے قلم کو بھی پسینہ آتا ہے۔ علامہ علی قاریؒ نے ”المشربہ الوردیہ فی مذہب المہمدی“ میں اس قصہ کا خوب ابطال کیا ہے۔ جس کا خلاصہ شیخ محمد البرزنجی الشافعیؒ کی ”الاشاعۃ لاشراط الساعۃ“ ص ۲۱ میں نواب صدیق الحسن خانؒ کی ”الاذاعۃ لما

کان دمایکون بین یدای الساعة“ ص ۱۶۳ میں اور ”روالمختار“ ص ۵۱ میں دیکھا جاسکتا ہے۔ علامہ سیوطی نے ”الاعلام بحکم عیسیٰ علیہ السلام“ کے نام سے ایک مستقل رسالہ اسی عنوان پر لکھا ہے جو ان کے مجموعہ فتاویٰ الحاوی ص ۱۵۵ میں مطبوع ہے۔ جس میں انھوں نے بھی اس بات کی پرزور تردید کی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مذاہب اربعہ میں سے کسی ایک مذہب کے پابند ہوں گے۔ اسی طرح علامہ لکھنوی نے بھی ”غیث ارقام“ ص ۵ پر اسی فکر کی تردید کی ہے اور صاف صاف لکھا ہے کہ یہ قول مردود ہے۔ بلکہ وہ دونوں یعنی حضرت عیسیٰ اور امام مہدی علیہما السلام مجتہد مستقل ہوں گے اور کسی کی تقلید کے محتاج نہیں ہوں گے۔ اسی سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ جو تقلیدی ذہن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مقلد بنانے پر ادھار کھائے بیٹھا ہے وہ دوسرے مجتہدین کے اجتہاد کو کیوں کہ تسلیم کر سکتا ہے ؟

کہا گیا ہے کہ شاہ ولی اللہ علوم اسلامیہ کے امام اور اسرار الہیہ کے رمز شاس ہونے کے باوجود مجتہد نہ تھے۔ بلکہ مذاہب اربعہ کے مقلد تھے اور فیوض الحرمین میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے سمجھایا کہ مذہب حنفی سنت کے قریب ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ شاہ صاحب برصغیر کے قدیم حنفی فکر کی کمزوری کو سمجھتے تھے اور اس کے برعکس مسلک شافعی کو اقرب الی السنۃ قرار دیتے تھے چنانچہ لکھتے ہیں :

”اما هذه المذاهب الاربعة فاقربها الى السنۃ مذهب الشافعی“

کہ ”ان مذاہب اربعہ میں سنت سے زیادہ قریب امام شافعی کا مذہب ہے“

(النجیر الکثیر ص ۱۸۱)

اسی قسم کا اظہار انھوں نے ”الانصاف“ میں بھی کیا ہے۔ بلکہ ایک اندازہ کے مطابق ۷۰ فیصد سے زائد مسائل میں ان کا رجحان امام شافعی کی جانب ہے۔ جیسا کہ ڈاکٹر مظہر یقانی ”اصول فقہ اور شاہ ولی اللہ“ کے صفحہ ۴۰ اور صفحہ ۵۰۲ میں بالتفصیل ذکر کیا ہے۔ مگر وہ ماحول سے متاثر تھے اس لیے علما حنفی رہے۔ البتہ ان کی یہ کوشش ضرور رہی کہ فقہ حنفی کو سنت کے مطابق بنایا جائے۔ چنانچہ ”فیوض الحرمین“ کی جو ادھوری عبارت ہمارے مکرم معاصر نے دی ہے اگر اسے پورا پیش کر دیا جاتا تو بات صاف ہو جاتی۔ چنانچہ ان

کے مکمل الفاظ کا ترجمہ یوں ہے :

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے یہ سمجھایا کہ حنفی مذہب میں ایک نفیس طریقہ، ان تمام طریقوں کی نسبت اس سنت کے زیادہ موافق ہے جو امام بخاریؒ اور ان کے اصحاب کے زمانہ میں ہوئی، اور وہ یہ ہے کہ ائمہ ثلاثہ (ابو حنیفہؒ، ابو یوسفؒ اور محمدؒ) کے اقوال میں سے وہ قول لیا جانے جو سنت کے سب سے زیادہ قریب ہے۔ اس کے بعد ان فقہاء اخلاف کے اقوال کا تتبع کیا جائے جو حدیث کے علم سے بھی باخبر تھے۔ اس لیے کہ بہت سی باتیں ایسی ہیں جن کے بارے میں ائمہ ثلاثہ نے سکوت اختیار کیا ہے لیکن ان کی نفی بھی نہیں کی اور حدیث اس پر دلالت کرتی ہے ایسی صورت میں اس کے اثبات کے سوا کوئی چارہ نہیں اور یہ تمام مذہب حنفی ہے۔“

قارئین کرام غور فرمائیں، بات کیا تھی اور کیا بنا دی گئی؟ شاہ صاحب کو جو طریقہ بتلایا گیا وہ تو یہ تھا کہ ائمہ ثلاثہ کے اقوال میں سے جو قول سنت کے زیادہ قریب ہو اسے اختیار کیا جائے اور جن مسائل میں انہوں نے خاموشی اختیار کی ہے اور ان پر متاخرین کے اقوال موجود ہیں اور حدیث بھی ان اقوال کی تائید ہے تو اسے بھی حنفی مذہب سمجھا جائے۔ مگر ہمارے مہربان یہ باور کرنا چاہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حنفی مذہب کی تعریف کی ہے۔ سو دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا!

اسی طرح یہ بات کہ ”مذہب اربعہ سے خروج کی مجھے ممانعت کی گئی ہے“ بھی من وجہ نقل نظر ہے۔ کیا دینی مسائل میں کشف والہام حجت ہے؟ قطعاً نہیں۔ ثانیاً مذہب اربعہ تو کیا، بلکہ اگر ائمہ اربعہ کسی مسئلہ پر متفق ہوں تو وہ حجت ہے؟ بالکل نہیں! شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں :

”ان اهل السنة لم يقل احدا منهم ان اجماع الفقهاء الاربعة

لہ شاہ صاحب کے اس کشف والہام کا اگر وہی مفہوم ہے جو ہمارے فاضل معاصر نے سمجھا ہے تو اس کے برعکس ان روایہء صادقہ کا کیا جواب ہوگا جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حنفیت کی طرف میلان کھنے والوں کے بارے میں اظہارِ ناراضگی فرمایا اور محدثین سے اظہارِ ہمدردی محبت فرمایا؟

۵ مجھے یاد ہے سب ذرا ذرا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو!

حجة معصومة ولا قال ان الحق منحصر فيها ولا يخرج منها

(منہاج السنۃ ص ۹۲)

باطل۔

کہ ”اہل سنت میں سے یہ کسی نے کہا ہے کہ ائمہ اربعہ کا اجماع حجت ہے اور نہ ہی یہ بات کسی نے کہی ہے کہ حق ان میں منحصر ہے اور جو ان سے خروج کرے وہ باطل ہے۔“

علامہ ذہبی نے ”منہاج السنۃ“ کے اختصار ”المنتقى“ ص ۱۵۷ میں بھی شیخ الاسلام کا یہ قول نقل کیا ہے۔ دورِ حاضر کے نامور حنفی عالم مولانا سرفراز صفدر اپنی ایک معرکہ الآراء تصنیف میں لکھتے ہیں :

”مذہب معلوم وہ کونسا محقق عالم ہے جس نے یہ کہا ہو کہ حق صرف ائمہ اربعہ میں منحصر ہے اور جو ان کی تقلید نہیں کرتا وہ قطعاً اور یقیناً باطل پر ہے؟ سینکڑوں امام ان کے علاوہ بھی گزرے ہیں اور لوگ ان کی بھی تقلید کرتے رہے ہیں۔ الخ۔“
(المنہاج الواضح ص ۱۳)

لہذا جب فقہاء اربعہ کا اجماع حجت نہیں اور حق ان میں منحصر نہیں تو مذاہب اربعہ ہی حق اور حجت کیسے ہو سکتے ہیں؟۔ ثالثاً کے معلوم نہیں کہ علمائے احناف نے قاضی ابن ابی یلیٰ کے قول کے مطابق گواہوں سے قسم لینے کو تنزیہ کے قائم مقام قرار دیا ہے؟ چنانچہ علامہ بحر العلوم شرح مسلم میں لکھتے ہیں :

”لو وجدنا رواية صحيحة من مجتهد آخر يجوز العمل بها لا تبرى
ان المتأخرين افتوا بتجليف الشهود اقامة له مقام التزكية على
مذهب ابن ابی یلیٰ۔“
(بحوالہ معیار الحق ص ۱۳۵)

کہ ”اگر کسی مجتہد کا صحیح قول مل جائے تو اس پر عمل جائز ہے۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ متاخرین نے ابن ابی یلیٰ کے قول کے مطابق فتویٰ دیا ہے کہ گواہوں سے قسم لینا تنزیہ کے قائم مقام ہے۔“

بلکہ خود شاہ صاحب نے عاملہ مرضعہ کے متعلق ائمہ اربعہ سے علیحدہ امام اسحاق بن ابویہ کے قول کو اختیار کیا ہے کہ چاہے وہ فدیہ دے بغیر قضاء کے اور اگر چاہے تو بغیر فدیہ قضا کر لے۔ دیکھئے مصنف ص ۲۵۱۔ ائمہ اربعہ مصارف زکوٰۃ میں ”مولفۃ قلوب“ کا مصرف تسلیم

نہیں کرتے۔ شاہ ولی اللہ یہاں بھی ان کے خلاف ہیں۔ البتہ امام شافعی کا ایک قول بھی یہی ہے العرف الشذی ص ۲۷۔ اسی طرح امام حسن بصریؒ تو مطلقاً نیند کو نواقض وضو شمار کرتے ہیں اور یہی رائے شاہ صاحب کی ہے۔ ”مصلیٰ ص ۲۷“ حالانکہ ائمہ اربعہ کے ہاں اس میں تفصیل ہے۔ ان حقائق کی روشنی میں مذاہب اربعہ کی پابندی کے آخر کیا معنی ہیں؟

اسی سلسلے میں مزید یہ استشہاد بھی پیش کیا گیا ہے کہ ”امام العصر مولانا انور شاہ صاحب کاشمیری بے نظیر وسعت مطالعہ کے باوجود فرمایا کرتے کہ ”تمام فنون میں میری اپنی رائے ہے لیکن فقہ میں مقلد محض ہوں“ پس جب یہ اکابرین مجتہدین کی تقلید سے بے نیاز نہیں ہو سکتے تو سر اکون ہو سکتا ہے؟ اب خواہ کوئی ائمہ اربعہ کی تقلید کرے یا بعد کے ایسے لوگوں کی، جو علم و دانش زہد و تقویٰ میں ان اکابر کی گرد کو بھی نہ پہنچے“ (مصلحہ ص ۲۷، ۲۸) تقلید کے لفظ سے اس قدر بیار اور اس میں اس حد تک غلو کہ باقی تمام علوم میں تو مجتہد بن جائیں مگر فقہ کی بات آئے تو مقلد محض؟۔ حالانکہ تقلید کی تعریف میں ”عدم علم“ شرط ہے۔ علامہ ابن قیمؒ لکھتے ہیں کہ ابن عبد البر اور دوسرے علماء نے کہا ہے کہ لوگوں کا اتفاق ہے کہ مقلد عالم نہیں ہوتا۔ (اعلام الموقعین ص ۱۷۱) اور خود علامہ ابن عبد البر کا کلام جامع بیسان العلم ص ۱۵۲ میں دیکھا جاسکتا ہے۔ جلیل القدر ابن المعتز سے نقل کرتے ہیں کہ ایک جانور اور مقلد کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ اور خود ان کی نظم و ایک شعر ہے

لا فرق بین مقلدا وبھیمة تنقاد بین جنادل ودعاش

اور یہی وجہ ہے کہ مقلد محض کو فتویٰ دینا جائز نہیں کہ وہ عالم نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ محض مفتی کا کلام نقل کرنے والا ہوتا ہے اور امام ابو حنیفہ رحمہ کے تلامذہ قاضی ابویوسف، زفر وغیرہ فرماتے ہیں:

”لا یحل لاحد ان یتقی بقولنا ما لم یعلم من این قلنا لان الفتوی لا یحل الا بالاجتہاد“

کہ ”کسی کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ ہمارے قول پر فتویٰ دے، جب تک اسے ہمارے قول کی دلیل معلوم نہ ہو کیوں کہ فتویٰ اجتہاد کے بغیر جائز نہیں“ (فتاویٰ النوازل ص ۳۸۱ لابی الیث المفسیہ السمرقندی)

بلکہ حضرت امام ابو حنیفہؒ بھی فرماتے ہیں کہ:

”حرام علی من لا یعرف دلیل ان یفتی بکلامی“

”کہ جو میرے قول کی دلیل سے واقف نہیں اسے میرے قول کے مطابق فتویٰ

دینا حرام ہے“ (المیزان الکبریٰ للشعرانی ص ۵۵)

سوال یہ ہے کہ تقلید جس کی بنیاد محض حسن ظن پر مبنی ہے۔ امام کو دیس معلوم ہوئی اس کی نفی تو خود انھوں نے کر دی کہ بلا معرفت دلیل ہمارے قول کی سہو پر مبنی ہے۔ اب ان کے قول پر فتویٰ کیا معرفت دلیل کے بعد ہے؟ اگر دیس معلوم ہے تو پھر تقلید کیسی؟ شاہ صاحب لکھتے ہیں:

”فما یظن فیمن کان موافقا لشیخہ فی اکثر المسائل لکنہ یعرف لکل

حکم دلیلًا ویطمئن قلبہ بذاتک الدلیل وهو علی بصیرۃ من امرک

انہ یس بمجتہد ظن فاسد الخ“

کہ ”پس ایسے عالم کے متعلق جو اکثر مسائل میں اپنے امام کے موافق ہو لیکن

اس کے ساتھ ہی ہر حکم کی دلیل سے واقف ہو اور وہ اپنے معاملہ میں خاص

سمجھ بوجھ رکھتا ہو یہ خیال کرنا کہ وہ مجتہد نہیں بالکل ایک فاسد گمان

ہے“ (عقد الجید ص ۹ طبع کراچی)

لہذا اگر یہ اکابر بشمول کاشمیری صاحب ائمہ کے اقوال و فتویٰ کے دلائل سے واقف

ہیں تو پھر بھی انہیں ”مقلد“ کہے جانا یا خود کو مقلد سمجھنا شاہ صاحب کی اصطلاح میں محض

”ظن فاسد“ ہے۔ اور اگر کوئی صاحب معرفت علم کے باوجود ”بھل“ کو ہی اپنا اعزاز

سمجھتا ہے تو ہم اس کے متعلق بجز اس کے اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ اپنے متعلق اتنی بدگمانی

اچھی نہیں۔

اور یہ بات بھی کتنی عجیب کہی کہ ”اب خواہ کوئی ائمہ اربعہ رحمہم اللہ کی تقلید کرے یا

بعد کے ایسے لوگوں کی جو علم و دانش اور زہد و تقویٰ میں ان اکابر کی گرد کو بھی نہیں پہنچتے جب

ہم ائمہ اربعہ کی تقلید کے قائل نہیں تو ان سے کم تر درجہ کے علماء کی تقلید کے کیا معنی؟ جب

ائمہ اربعہ کے تلامذہ نے اولہ کی روشنی میں اپنے شیوخ سے اختلاف کیا اور اس اختلاف کو

قبول ہی کر لیا گیا۔ حدیث کہ عبادات میں امام الوضیف کی تقلید اور وقف و قضاء کے معاملہ میں

قاضی ابویوسف کے فتاویٰ کو اختیار کرنے کا حکم دیا گیا، جیسا کہ شامی اور عالمگیری وغیرہ میں

ہے۔ بلکہ کبھی مجبوراً شافعی قاضی سے فتویٰ حاصل کر کے وقتی ضرورت کو پورا کرنے کی بھی اجازت دے دی گئی۔ نیز فتویٰ میں ”ارفق بالناس“ اور ”موافق بعرف بلدہ“ کو بھی ملحوظ رکھنے کی تلقین کی گئی۔ مگر یہ کہنے کی جرأت نصیب نہ ہوئی کہ دلیل امام کے قول کے خلاف ہے۔ لہذا امام دیس کی روشنی میں امام کے قول کو چھوڑتے ہیں اور اس کے مقابلہ میں جس امام کا قول دلیل کے مطابق ہے اسے قبول کرتے ہیں۔ حالانکہ یہی فکر تمام سلف کا تھا جیسا کہ علامہ نے علامہ شعرانی کے حوالہ سے لکھا ہے :

”اصحاب مذاہب کے زمانہ سے لے کر آج تک مذہب معین کا التزام کئے بغیر مذاہب پر عمل کرتے اور فتویٰ دیتے تھے علمائے سلف اور حال اسی پر ہیں یہاں تک کہ یہ امر متفق علیہ اور گویا مسلمانوں کا ایسا طریقہ ہو گیا ہے کہ اس سے مختلف ہونا صحیح نہیں“ (عقد المجید ص ۱۲)

اور خود علامہ شعرانی کا کلام المیزان الکبریٰ ص ۱۵، ۱۶ میں دیکھا جاسکتا ہے۔ لہذا جب ”سبیل المؤمنین“ یہی ہے تو اس سے روگردانی اور اس کے مقابلہ میں متعین مذہب کی دعوت کا انجام متعین ہے جس سے کوئی بھی ناواقف نہیں۔

اللہم اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیہم۔ الخ !

اختلاف الفقہاء کے اسباب اور تعامل سلف کی حیثیت :

شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے ”رفع الملام عن الأئمة الاعلام“ میں اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے ”حجۃ الشریعہ“ اور ”الانصاف فی بیان سبب الاختلاف“ میں اس موضوع پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے کہ حضرات صحابہ کرام اور فقہاء عظام کے مابین فقہی اختلاف کے اسباب و وجوہ کیا تھے؟ چنانچہ اس سلسلے میں ان کے اقوال کا خلاصہ یہ ہے کہ اختلاف کے اسباب حسب ذیل ہیں :

- ۱۔ حدیث کی صحت و ضعف میں اختلاف۔
- ۲۔ صحت حدیث کے اصول مقررہ میں اختلاف۔
- ۳۔ حدیث کا بھول جانا یا حدیث کا علم نہ ہونا۔
- ۴۔ دلالت حدیث کی عدم معرفت۔

۵۔ حدیث کے معارض کسی اور ذلیل کا ہونا۔

۶۔ حدیث کا اس مسئلہ پر دلالت نہ کرنا وغیرہ۔

حضرت امام شافعیؒ، جنہیں اصول فقہ کے مؤسس اور مدون ہونے کا شرف حاصل ہے، کا اپنے پیش رو حضرات بالخصوص امام مالکؒ اور امام ابو حنیفہؒ سے اختلاف کوئی ڈھکا چھپا نہیں بلکہ امام مالکؒ استاد بھی ہیں لیکن اس کے باوجود مسائل کیا، قواعد و اصول میں بھی امام شافعیؒ ان سے اختلاف کرتے ہیں۔ انہی میں ایک یہ ہے کہ کیا ”عمل اہل مدینہ“ حجت ہے یا نہیں؟ امام شافعیؒ اس کے قائل نہیں مگر امام مالکؒ بڑی شدت سے اس سے قائل ہیں۔ اسی طرح امام ابو حنیفہؒ کا بھی طرز عمل عواما ہی ہے کہ وہ اہل کوفہ کی نقل پر اعتماد کرتے ہیں حتیٰ کہ شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ ان کے فتاویٰ کی بنیاد عموماً ابراہیم نخعی کے فتاویٰ پر ہوتی ہے۔ (حجت اللہ) مگر امام شافعیؒ کا موقف ان کے خلاف ہے ان کا کہنا ہے کہ حضرات صحابہ کرام اور تابعین عظام کسی مسئلہ میں حدیث کے متلاشی ہوتے تھے۔ اگر حدیث نہ ہوتی تو پھر استدلال کی دوسری انواع اجتہاد وغیرہ پر عمل کرتے اور اگر اس کے بعد کسی وقت حدیث مل گئی تو حدیث کی بناء پر اپنے اجتہاد اور فتاویٰ سے رجوع کر لیتے تھے۔ شاہ صاحب نے امام شافعیؒ کے موقف کی خوب وضاحت کی ہے اور اس سلسلے میں چند مثالیں بھی ذکر کی ہیں۔ یہ ساری تفصیل حجت اللہ میں دیکھی جاسکتی ہے۔

جہود متاخر نے امام شافعیؒ کی تائید کی ہے۔ خود محققین مالیکہ نے تعامل مدینہ کو کلیۃً قبول نہیں کیا۔ ان کا کہنا ہے کہ اجماع مدینہ یا ”تعامل اہل مدینہ“ کی دو قسمیں ہیں ایک نقلی دوسری استدلالی۔ نقلی یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے کوئی عمل نقل در نقل چلا آئے۔ مثلاً اوزان صاع و عدد و کلمات اذان و اقامت وغیرہ۔ اس صورت کو وہ بلا خلاف حجت مانتے ہیں اور اس کے مقابلہ میں اخبار کو ترک کر دینے کے قائل ہیں۔ اور تعامل استدلالی میں اختلاف ہے جس کی تفصیل قاضی شوکانی کی الارشاد میں دیکھی جاسکتی ہے۔

مگر صد افسوس کہ لدھیانوی صاحب امام شافعیؒ اور جہود کے اس نظریہ کو رفض کا حنفی شعبہ قرار دینے پر تلے بیٹھے ہیں چنانچہ موصوف لکھتے ہیں:

”خیر القروہ کے بعض علماء جہود کے اصول کو تسلیم نہیں کرتے تھے اور اس

یہ احادیث کی صحت و قہم اور ان کے معمول بہا ہونے نہ ہونے کا مدار صرف سند کی صحت و ضعف پر رہ گیا۔ یہاں تک کہ بعض لوگوں کا خیال ہونے لگا کہ ایسی روایت میں جس کے راوی ثقہ ہوں، اس کے مقابلہ میں حضرات خلفاء راشدین کا تعامل بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ کسی روایت کے راویوں کی ثقاہت و عدالت اور فہم و دیانت کو حضرات خلفاء راشدین کے تعامل پر ترجیح دے ڈالنا نہ صرف یہ کہ صحت مندانہ طرز فکر نہیں ہو سکتا بلکہ اگر اسے رفض کا خفی شعبہ کہا جائے تو شاید بے جا نہ ہوگا۔“ (بینات ص ۴۳)

بینات کا مولہ صفحہ پڑھنا چاہیے، بات تعامل مدینہ یا سلف کے عمومی عمل کی ہے جسے اصطلاحاً زیادہ سے زیادہ بہور کا عمل کہا جاسکتا ہے۔ ”خلفاء راشدین“ کے عمل کی نہیں۔ اسی طرح یہ کہنا کہ ”احادیث کے معمول بہا ہونے کا مدار صرف سند کی صحت و ضعف پر رہ گیا۔“ اصول حدیث سے ناواقفی کی بین دلیل ہے۔ جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ جہاں تک تعاون و توارث کا تعلق ہے تو اصول فقہ میں اولہ شرعیہ (قرآن - سنت - اجماع - قیاس) چار ہیں۔ تعامل و توارث کو ”حجت قاطعہ“ کہنا محض لدھیانوی صاحب کی خانہ ساز اچھ ہے۔ افسوس کہ موصوف تعامل کو شاید ”اجماع“ کا مترادف قرار دینے پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔ حالانکہ ان دونوں میں فرق بین ہے۔ انتہائی تعجب کی بات یہ ہے کہ قاضی ابویوسف کی موجودگی میں جب امام مالکؒ نے صاع کا وزن ”توارثاً“ پانچ رطل اور ایک رطل کا ثلث ہونا ثابت کیا تو قاضی صاحب اپنے سابقہ موقف سے دست بردار ہو گئے اور مالکؒ کے موقف کو قبول کر لیا لیکن کیا وجہ ہے تعامل و توارث کو ”حجت قاطعہ“ قرار دینے والے آج بھی اس کا انکار کر رہے ہیں۔ آخر یہ تعامل نظر سے محجوب کیوں ہے؟۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے امام شافعیؒ کی ہم نوائی میں ”خیار مجلس“ کی حدیث کو بھی ذکر کیا ہے جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ فقہاء کوفہ وغیرہ کا تعامل اس پر نہیں۔ حالانکہ خیار مجلس کی یہ حدیث حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حکیم بن حزام، ابو ہریرہؓ، عبد اللہ بن عمروؓ، سمر بن جندب، ابو ہریرہؓ، ابن عباسؓ اور جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے اور ابن عبداللہ نے کہا ہے کہ اخاف اور مالیکہ کے علاوہ اکثر اہل علم اسی کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں اور اس حدیث کی صحت پر علماء کا اجماع ہے۔ (الزرقانی ص ۳۲۱) اسی حدیث کے ظاہر پر حضرت عبداللہ بن

عمر اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما کا عمل تھا جیسا کہ امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے بلکہ حافظ ابن حجرؒ نے کہا ہے:

”لا یحرف لہما مخالف من الصحابة“

کہ ”صحابہ کرامؓ میں سے کوئی ان کا مخالف معلوم نہیں ہوتا“

پہلی مسلک بعد میں قاضی شریح، امام شعبی، طاؤس، ابن ابی ملیک، سعید بن السیب، زہری، ابن ابی ذئب، حسن بصری، اوزاعی وغیرہ کا ہے۔ امام شافعی، امام احمد اور امام اسحاق جی اسی پر فتویٰ دیتے تھے۔ شاہ ولی اللہ نے بھی امام شافعیؒ کی کا موقف صحیح قرار دیا ہے۔ مگر جنہوں نے تقلید و جمود کی قسم اٹھا رکھی ہے ذرا ان کا عمل بھی دیکھ لیجئے۔ شیخ الہند محمود الحسن فرماتے ہیں:

”خلاصہ کلام کہ مسئلہ خیال مجلس اہم مسائل میں سے ہے۔ اور امام ابو حنیفہؒ نے اس میں جمہور اور اکثر متقدمین و متاخرین کی مخالفت کی ہے۔ انھوں نے ان کے مذہب کی تردید میں رسائل بھی لکھے ہیں اور شاہ ولی اللہ قدس سرہ نے بھی مذہب شافعی کو ”من جہۃ الاحادیث والنصوص“ (امادیت و منصوص کی بنا پر ترمذی) دی ہے۔ اسی طرح ہمارے شیخ مدظلہ نے ان کے مذہب کو ترمذی دی اور فرمایا۔ الحق والانصاف ان التراجیم للشافعی فی ہذہ المسئلة ونحن مقلدون یجب علینا تقلید اہامنا ابی حنیفہ رحمہ اللہ۔ کہ ”حق اور انصاف یہ ہے کہ اس مسئلہ میں ترمذی شافعی کے قول کو ہے اور ہم مقلد ہیں۔ ہم پر ہمارے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی تقلید واجب ہے۔“

(تقریر ترمذی ص ۳۹ طبع رشیدیہ دہلی)

یہ عبارت کسی تبصرہ کی محتاج نہیں ہم ایسی تقلید کو بدترین مگرابی اور طریقہ سلف کے خلاف سمجھتے ہیں۔

اسی طرح دیکھئے ”احکام الصیاد والذبايح“ میں ”ذکوۃ الجنین ذکوۃ امہ“

کی حدیث گیارہ صحابہ سے مروی ہے اور ابن المنذر فرماتے ہیں:

”لم یرو عن احد من الصحابة ولا من العلماء ان الجنین لا

کہ ”صحابہ کرامؓ اور اہل علم میں سے کسی سے منقول نہیں کہ وہ کہتے ہوں کہ بچے کو فزع کرنے کے بعد ہی کھانا چاہیے۔“ (نیل الاوطار ص ۱۵۱ وغیرہ)

مگر توارث کو ”حجت قاطعہ“ سمجھنے والوں کے ہاں یہاں بھی امام ابو حنیفہ اور ایک قول کے مطابق ابراہیم نخعی کے قول کی بنا پر نہ حدیث کا لحاظ نہ توارث کا پاس ہے۔

مزید دیکھئے۔ حلالہ کی حرمت اور اس پر عمل کرنے والے پر لعنت کا ذکر احادیث میں مذکور ہے۔ حضرت عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ، ابن مسعودؓ اور دیگر صحابہ کرامؓ حلالہ کے سخت مخالف، یہاں تک کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قویہ بھی اعلان کر دیا کہ حلالہ کرنے والا مل گیا تو سنگسار کرادوں گا، امام مالک، امام شافعی، احمد، اسحاق، لیث، ابو عبیدہ، بلکہ قاضی ابویوسف تک سب یک زبان کہ حلالہ کی نیت سے کیا ہوا نکاح فاسد مگر خلفائے راشدینؓ اور ”عملی توارث“ کے مدعی یہاں بھی اپنا کرتب دکھا گئے بلکہ یہاں تک کہہ دیا گیا کہ اگر نیت خیر خواہی کی ہوگی تو اس کا اجر ملے گا۔“ (در مختار، معاذ اللہ۔)

ہم چلتے ہوئے انہی چند مسائل کی نشاندہی پر اکتفا کرتے ہیں۔ ورنہ ہمارے پیش نظر اس سلسلے میں متعدد مثالیں موجود ہیں۔ آخر کیا وجہ ہے کہ ان مسائل میں توارث اور تعامل خلفاء پر عمل نہیں کیا گیا؟ — اور یہ دیکھ کر تو میری حیرت کی انتہاء نہ رہی کہ لکھنا نوی صاحب بڑی جرأت سے لکھتے ہیں :

”بہی وہ کار نامہ ہے جو ائمہ احناف نے انجام دیا انہوں نے کسی مسئلہ میں بھی صواب و تابعین کے تعامل سے صوف نظر نہیں کیا۔ لیکن بعد کے فقہاء و محدثین کو اس معیار کا قائم رکھنا مشکل تھا اس لیے انہوں نے روایات کی صحت و ضعف کو اصل معیار قرار دیا۔“ (بینات ص ۴۴)

اس عبارت کو ذرا ان کی سابقہ عبارت سے ملا لیجئے جس میں کہا گیا ہے کہ توارث و تعامل کی بجائے صرف راویوں کی ثقاہت پر اعتماد کرنا نہ صحت مندانہ طرز فکر ہے بلکہ یہ رخص کا خفی شعبہ ہے۔ اس کا مطلب تو واضح ہے کہ صحت مندانہ طرز فکر صرف ائمہ احناف برقرار رکھ سکے۔ امام مالک، امام شافعی اور امام احمد وغیرہ کے عمل میں معاذ اللہ رخص کا خفی شعبہ پایا جاتا ہے۔

مگر ہم انہی مندرجہ بالا چند مثالوں سے واضح کر چکے ہیں کہ توارث و تعامل کا یہ خوش کن نعرہ محض طفلانہ بڑھک ہے۔ ایک عامی آدمی کے لیے یہ تصور تو بڑا حسین و دلکش ہے کہ ہم تعامل سلف کے پابند ہیں مگر یقین جانیئے اس کی مثال ہاتھی دانت کی ہے کہ کھانے کے اور دکھانے کے اور ہیں۔

خلاصہ کلام ”تعال“ ”حجت قاطعہ“ نہیں۔ اصل حجت قرآن و سنت یا پھر اجماع ہے۔ اور اگر کہا جائے کہ کوئی حدیث ایسی نہیں جس پر خلفاء راشدین نے بالاتفاق عمل نہیں کیا۔ یا خلفاء راشدین نہ کسی صحیح حدیث کے خلاف پر متفق نہیں۔ تو اس میں ہم ان شاء اللہ حق بجانب ہوں گے۔

کیا صحیحین کی روایت مقدم ہے؟

متاخرین علما نے فن اس بات پر متفق ہیں کہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی روایات کو دوسری صحیح روایات پر یک گونہ ترجیح ہے۔ اور اس کا ایک سبب یہ ہے کہ ان کو ان کے مؤلفین کے زمانہ سے لے کر آج تک تلفی بالقبول حاصل ہے۔ اور یہ ان دونوں کا ایسا شرف و فضل ہے جس کا اعتراف تمام ائمہ فن نے کیا ہے۔ اسی طرح صحیحین کی احادیث کے مقدم ہونے کا نظریہ بھی تمام ائمہ اصول کے ہاں متفق رہا ہے۔ لیکن نویں صدی ہجری میں علامہ ابن ہمام نے سب سے اول فتح القدیر ص ۳۱۸ ج ۱ اور ص ۱۸۶ ج ۲ میں اور ان کے بعد ان کے تلمیذ ابن امیر الحاج نے التقریر والتخریر فی شرح کتاب التقریر ص ۳۲ میں اس سے اختلاف کیا۔ یہ دونوں بزرگ حنفی مکتب فکر کے حامل تھے۔ متاخرین علمائے اخلاف نے بھی عموماً ان کی ہمنوائی فرمائی اور اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اس سے مسلک حنفی کی مؤیدہ روایات کو اولاً صحیح باور کرانے کی کوشش کی جائے پھر کہا جائے کہ یہ روایات بھی صحیح ہیں لہذا ان کو مروج اور صحیحین کی کوراج قرار دینا محکم ہے۔ شیخ عبدالحق، جو خود اس مسئلہ میں ابن ہمام کے قبح ہیں، نے صاف صاف لکھا ہے :

”واین سخن نافع و مفید است در غرض از شرح این کتاب کہ اثبات متابید مذاہب ائمہ مجتہدین است خصوصاً مذہب حنفی و غرض شیخ ابن الہمام نیز

کہ ”یہ بات بہت نافع لحد مفید ہے اس سفر السعادت) کتاب کی شرح کے لیے اور مذاہب ائمہ مجتہدین کے مذاہب کی تائید کے لیے بالخصوص مذہب حنفی کی تائید کے لیے اور شیخ ابن ہمام کی بھی غرض یہی ہے“

(شرح سفر السعادت ص ۱۲۹۲)

لیجئے یہ ہے حقیقت واقعہ اس اصول کو اختیار کرنے کی

نکل جائے جن کے منہ سے سچی بات مستی میں

فقہ مصلحت بن سے وہ ایسا زندقہ خوار اچھا

یہی وجہ ہے کہ علامہ الجزائرئی نے اس فکر کے حاملین پر شدید نکتہ چینی کرتے ہوئے

انہیں ”بعض ارباب الایواء“ کے الفاظ سے ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ:

”والحاصل ان مزیة الصبیحین ثابتة ثبوت الجبال الرواسی لا

ینکرها الا غریز بنفسه وهو لا یشعر“ (توجیہ النظر ص ۱۲)

بلکہ متاخرین علمائے احناف میں سے علامہ عبدالحی لکھنوی مرحوم نے بھی بڑی شدت سے

علامہ ابن ہمام کی مخالفت کی ہے۔ علامہ موصوف لکھتے ہیں:

”هذا الترتیب قد اطبقت علیه کلمات المحدثین بل یکاد ان

یکون مجعلا علیه بین المتبحرین ولم یخالف فیہ الا ابن الہمام

وابن امیر الحاج العلام ومن تبعهما فی هذا المرام“

”اس ترتیب (کہ پہلے ترجیح صحیحین کی روایات کو ہوگی) الخ پر محدثین کا کلام قرناً

بعد قرن منقول چلا آتا ہے بلکہ متبحر علماء کا تقریباً اس پر اجماع ہے اور اس

کی مخالفت صرف ابن ہمام، ابن امیر الحاج اور ان کے تبعین نے ہی کی

ہے۔“ (الاجوبۃ الفاضلۃ در مجموعہ رسائل سبعہ ص ۵۲)

علامہ لکھنوی کے ان الفاظ سے لدھیانوی صاحب اور انہی کے ہم خیال دوسرے حضرات

کی غلط فہمی دور ہو جاتی ہے کہ صحیحین کی روایات کو مقدم جاننے کا اصول بعض شافعیہ کا ہے۔

(مبانی ص ۵۹) حضرت مولانا بشیر احمد مھسوانی نے علامہ ابن ہمام کے اس نظریہ کا ابطال

”شفاء الغی“ میں بڑی تفصیل سے کیا ہے۔ اور بعد میں علامہ لکھنوی نے ”ابرار الغی“ میں

بھی ان کی تائید کی ہے اور صاف الفاظ میں لکھا ہے:

”قول ابن الہمام فی هذا المقام غیر مقبول عند محقق الاعلام

کما بسطہ صاحب دراسات اللیب الخ“

کہ ”اس بحث میں ابن ہمام کا قول محققین کے ہاں مقبول نہیں جیسا کہ صاحب

دراسات اللیب نے تفصیل سے لکھا ہے“ (البرزانی ص ۳۴)

علامہ ابن ہمام نے اپنے اس نظریہ کو ”سنن مغرب“ کے ضمن میں بیان کیا ہے اور

اس بحث کا مستقل جواب علامہ جمال الدین قاسمی نے ایک مستقل رسالہ ”الاجوبۃ المرفیۃ“

میں دیا ہے جو قابل دید ہے۔

الغرض دوسرے علماء کے علاوہ خود محققین علمائے احناف نے بھی ابن ہمام کی تائید

نہیں کی۔ تعجب ہے کہ یہ بات تو تسلیم کر لی گئی کہ ابن ہمام کی منفرد آراء جو ”ہمارے مذہب“

کے خلاف ہیں وہ مقبول نہیں رہیں۔ (البحر الرائق ص ۱۲۵ العرف الشذی ص ۵) مگر ان کی رائے

جو تمام متقدمین کے خلاف ہے اور ان کے بعد بعض محقق احناف نے بھی ان کی تردید

کی ہے، وہ محض اس لیے مقبول کہ اس سے ”ہمارے مذہب“ کی تائید ہوتی ہے۔

تیری زلف میں پہنچی تو حسن کہلائی

وہ تیرگی جو مرے نامہ سیاہ میں تھی!

یہ ہیں وہ چند اصولی مباحث جن کا ذکر لدھیانوی صاحب نے بیانات کے اس

دوسرے حصہ میں کیا ہے۔ مگر آپ دیکھ آئے ہیں کہ موصوف اپنے معومات کو ثابت

کرنے میں بری طرح ناکام رہے ہیں۔

باقی رہے وہ مسائل جن کا تذکرہ اس کے بعد ہوا ہے تو ان پر پہلے ہی فریقین کی

طرف سے بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ بلکہ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ ان مسائل میں

عدم ثبوت کے اعتبار سے جن دلائل میں وزن ہے وہ فریقین کے مزجوم اکابر لکھ چکے

ہیں۔ اسی لیے سر دست ہم ان مباحث سے صرف نظر کرتے ہیں۔ اور اگر ضرورت

محسوس کی گئی تو ان شاء اللہ لدھیانوی صاحب کے مزجومہ دلائل کی حقیقت بھی بیان کر

دی جائے گی۔